ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2904

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ — شعبہ حدیث وعلوم حدیث

کورس: تاریخ حدیث-1 (2904) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی منصوبہ نمبر 1

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: عہدِ نبوی میں مکتوبہ معاہدات و فرامین — جامع نوٹ

سوال نمبر 1: عہدِ نبوی میں مکتوبہ معاہدات و فرامین کے بارے میں وضاحت کیجیے۔ اس موضوع پر ایک جامع نوٹ تحریر کیجیے۔ (20 نمبر)

تعارف

عہدِ نبوی میں حدیث اور دینی احکام کی حفاظت کا عام تصور یہ ہے کہ یہ سلسلہ صرف زبانی روایت پر قائم تھا، لیکن تاریخی حقائق اس سے آگے کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور ہی میں کتابت کا باقاعدہ نظام موجود تھا۔ کاتبینِ وحی قرآن مجید لکھتے تھے، مختلف قبائل اور حکمرانوں کو خطوط بھیجے جاتے تھے، معاہدے تحریری صورت میں ضبط ہوتے تھے اور گورنروں اور عاملوں کو تحریری فرامین اور ہدایات جاری کی جاتی تھیں۔ یہ مکتوبہ معاہدات و فرامین تاریخِ حدیث کے مطالعے میں اس لیے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ تحریری ثبوت، دستاویزی نظم اور عملی احکام کی مثالیں نبوی دور ہی سے اسلام کا حصہ تھی۔ یہ دستاویزات ایک طرف دعوت و تبلیغ کا ذریعہ تھیں، دوسری طرف نئی اسلامی ریاست کے انتظام، قانون، محصولات اور بین القبائلی تعلقات کی بنیاد بھی تھیں۔ ان میں سے کئی دستاویزات کے متن سیرت اور حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہیں، خصوصاً ابن سعد کی الطبقات، ابن ہشام کی سیرت اور بعد میں جمع کی گئی مکتوباتِ نبوی کی تصانیف میں ان کی تفصیل ملتی ہے۔ سوال میں اسی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے کہ عہدِ نبوی کے مکتوبہ معاہدات و فرامین کی نوعیت کیا تھی، ان کی اہم اقسام کون سی تھیں اور ان کا حدیث اور تاریخ سے کیا تعلق ہے۔ ذیل میں موضوع کو تعارف، اقسام، مشہور مثالوں، خصوصیات اور ان کے علمی و تاریخی اثرات کے عنوانات کے تحت جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے، اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ ہر بات معیاری سیرت و تاریخِ حدیث کے مآخذ کی روشنی میں کہی جائے۔

عہدِ نبوی میں کتابت کا پس منظر

مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد تحریر کی ضرورت روزمرہ کی حقیقت بن گئی۔ قرآن مجید کی کتابت کے لیے کاتبینِ وحی کی ایک جماعت مقرر تھی، جن میں سیدنا زید بن ثابت، ابی بن کعب، معاویہ بن ابی سفیان اور دیگر صحابہ شامل تھے۔ وحی کے علاوہ بھی متعدد صحابہ لکھنا جانتے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صلاحیت کی حوصلہ افزائی فرمائی، چنانچہ جنگِ بدر کے بعض قیدیوں کی رہائی کا فدیہ یہ بھی قرار پایا کہ وہ مدینے کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ اس ماحول میں جب ریاست کے حدود پھیلے، نئے قبائل اسلام میں داخل ہوئے اور دور دراز علاقوں میں عامل مقرر ہوئے تو تحریری ہدایات ناگزیر ہو گئیں، کیونکہ زبانی پیغام ہر جگہ یکساں درستی کے ساتھ نہیں پہنچایا جا سکتا

تھا۔ تحریری فرمان کا فائدہ یہ تھا کہ اس کی عبارت محفوظ رہتی، اس پر مہرِ نبوی سے تصدیق ہوتی اور اسے بعد میں بھی بطورِ سند پیش کیا جا سکتا تھا۔ بعض صحابہ نے احادیث بھی ذاتی طور پر لکھیں، چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص کا صحیفہ صادقہ اسی دور کی تحریری کوشش کی مشہور مثال ہے، جبکہ عام ہدایت یہ تھی کہ قرآن کے ساتھ اس کا ملتبس ہونے کا خدشہ نہ رہے، اس لیے ابتدائی دور میں باقاعدہ تدوین کے بجائے تحریر منتخب مواقع پر اور ضرورت کے مطابق ہوتی رہی۔

مکتوبہ معاہدات کی اقسام اور مشہور مثالیں

عہدِ نبوی کے مکتوبہ معاہدات کو ان کے مقصد کے لحاظ سے چند بڑی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم وہ داخلی دستوری معاہدہ ہے جسے میثاقِ مدینہ یا صحیفۂ مدینہ کہا جاتا ہے۔ ہجرت کے بعد مہاجرین، انصار کے قبائل اوس و خزرج اور مدینے کے یہودی قبائل کے درمیان یہ تحریری معاہدہ ہوا جس میں شہر کے دفاع، باہمی امداد، خون بہا، فدیہ اور اختلافات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹانے جیسی شقیں درج تھیں۔ یہ دستاویز تاریخ میں شہری ریاست کے ابتدائی تحریری معاہدوں میں شمار ہوتی ہے اور اس کا متن سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ دوسری قسم صلح و امن کے معاہدے ہیں، جن میں سب سے مشہور صلح حدیبیہ ہے، جو تحریری صورت میں لکھی گئی اور اس کے کاتب سیدنا علی بن ابی طالب تھے؛ اس میں دس سال جنگ بندی، عمرے کی اجازت اور قبائل کی آزادی جیسی شرائط درج ہوئیں۔ اسی طرح مختلف قبائل جیسے بنو ضمرہ اور جہینہ وغیرہ سے امن کے عہد نامے ہوئے، نجران کے عیسائیوں سے ان کی جان، مال اور عبادت گاہوں کی حفاظت کا تحریری معاہدہ ہوا، اور اہلِ ایلہ، جرباء و اذرح اور دومۃ الجندل وغیرہ سے بھی صلح نامے اور امان کی تحریریں ملیں۔ ان معاہدوں میں جزیہ یا مقررہ شرائط جہاں طے ہوئیں وہ بھی درج کی گئیں تاکہ بعد میں کوئی تنازع پیدا نہ ہو۔

Figure 1: Main Types of Written Treaties and Farmans in the Prophetic Era

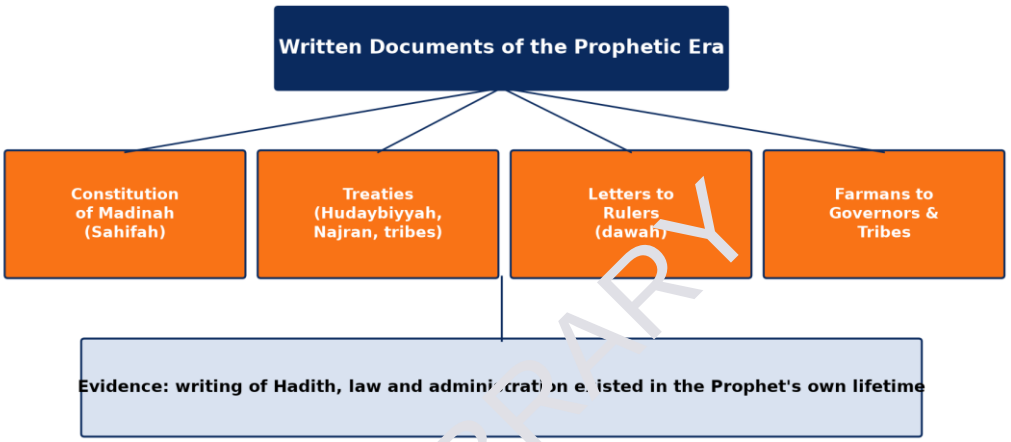

شکل 1: عہدِ نبوی کی مکتوبہ دستاویزات کی بڑی اقسام

بادشاہوں اور حکمرانوں کے نام خطوط

معاہدات کے ساتھ ساتھ نبوی مکتوبات کی ایک بلند پایہ قسم وہ خطوط ہیں جو بیرونی حکمرانوں کو دعوتِ اسلام کے لیے لکھے گئے۔ حدیبیہ کے بعد کے دور میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روم کے قیصر ہرقل، فارس کے کسریٰ خسرو پرویز، مصر کے مقوقس، حبشہ کے نجاشی، بحرین کے منذر بن ساویٰ، یمامہ کے ہوذہ بن علی، غسان کے حارث بن ابی شمر اور عمان کے حکمرانوں وغیرہ کو خطوط لکھوائے جن میں اسلام کی دعوت، امن کی شرط اور انکار کی صورت میں ذمہ داری کا ذکر تھا۔ یہ خطوط ایلچی صحابہ کے ہاتھ روانہ کیے گئے، مثلاً دحیہ کلبی قیصر کی طرف، عبداللہ بن حذافہ کسریٰ کی طرف اور حاطب بن ابی بلتعہ مقوقس کی طرف بھیجے گئے۔ مقوقس اور نجاشی وغیرہ کے جوابات اور بعض خطوط کے اصل متنوں کے محفوظ رہنے کی روایات بھی کتابوں میں ملتی ہیں۔ ان مکتوبات کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ ان سے نبوی دعوت کا عالمی دائرہ، سفارتی آداب، مہرِ نبوی کا استعمال اور اس دور کے تحریری اسلوب کا مستند نمونہ ملتا ہے، اور یہ سب کچھ تاریخِ حدیث میں اس لیے بھی قیمتی ہے کہ ان میں سے بعض روایات باقاعدہ اسناد کے ساتھ کتبِ حدیث میں درج ہیں۔

فرامین: عاملوں اور قبائل کو تحریری ہدایات

فرامین سے مراد وہ تحریری احکامات اور ہدایات ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے گورنروں، عاملوں، قاضیوں اور قبائل کو بھیجے۔ ان میں سب سے نمائندہ مثال یمن روانہ کیے جانے والے صحابہ کو دی گئی تحریریں ہیں۔ سیدنا عمرو بن حزم کو جب نجران کی طرف بھیجا گیا تو انہیں ایک مفصل تحریری فرمان دیا گیا جس میں زکاۃ، صدقات، دیات اور دیگر احکام درج تھے؛ یہ دستاویز بعد میں کتابِ عمرو بن حزم کے نام سے مشہور ہوئی اور فقہ و حدیث میں بکثرت اس سے استدلال ہوا۔ اسی طرح سیدنا معاذ بن جبل اور سیدنا ابو موسیٰ اشعری کو یمن کے لیے ہدایات دی گئیں، سیدنا خالد بن ولید اور مختلف سرداروں کے علاقوں کے لیے احکام لکھے گئے، اور وفدِ ثقیف کی درخواست پر ان کے لیے ایک تحریر لکھی گئی جس میں نماز اور زکاۃ وغیرہ کی تفصیل تھی۔ سیدنا وائل بن حجر اور دیگر وفود کو بھی مکتوبہ فرامین عطا ہوئے۔ زکاۃ کے نصاب اور احکام پر مشتمل وہ تحریر جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس محفوظ تھی اور بعد میں سیدنا ابو بکر کے دور میں انس بن مالک کو بحرین روانگی پر اس کی نقل دی گئی اسی سلسلے کی کڑی ہے اور صحیح بخاری میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ ان فرامین سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوی دور میں اہم شرعی احکام محض زبانی نہیں بلکہ مستند تحریری صورت میں جاری کیا کرتے تھے۔

جدول 1: عہدِ نبوی کی اہم مکتوبہ دستاویزات — خلاصہ

دستاویز	نوعیت	اہم مضمون / اہمیت
صحیفۂ مدینہ (میثاقِ مدینہ)	داخلی دستوری معاہدہ	شہر کا دفاع، باہمی امداد، تنازعات کا مرجع؛ شہری ریاست کی تحریری بنیاد
صلحِ حدیبیہ	صلح نامہ	دس سال جنگ بندی، عمرے کی شرط؛ کاتب سیدنا علی بن ابی طالب
قیصر، کسریٰ، مقوقس، نجاشی وغیرہ کو دعوتِ اسلام؛	دعوتی مکتوبات	خطوط بہ نامِ حکمرانان

مہرِ نبوی کا استعمال		
زکاۃ، صدقات اور دیات کے مفصل احکام؛ فقہی استدلال کا ماخذ	فرمان برائے عامل	کتابِ عمرو بن حزم
جان، مال اور عبادت گاہوں کی حفاظت کی تحریری ضمانت	امان و تحفظ کا معاہدہ	اہلِ نجران کا عہد نامہ

ان دستاویزات کی خصوصیات اور تاریخِ حدیث میں مقام

ان مکتوبہ معاہدات و فرامین کی چند مشترکہ خصوصیات قابلِ ذکر ہیں۔ اول یہ کہ ان کی تحریر مختصر مگر جامع ہوتی تھی اور اغلباً بسم اللہ اور بھیجنے والے کے تعارف سے ہوتا تھا۔ دوم ان پر مہرِ نبوی لگتی تھی جس پر محمد رسول اللہ کے الفاظ کندہ تھے، تاکہ جعل سازی ممکن نہ رہے اور وصول کنندہ کو دستاویز کی صحت کا یقین ہو۔ سوم ان دستاویزات کی نقلیں متعلقہ افراد اور قبیلوں کے پاس محفوظ رہتیں اور نسل در نسل منتقل ہوتیں، چنانچہ بعض صحائف خاندانوں میں اسی طرح محفوظ رہے جس طرح صحیفۂ عمرو بن حزم ان کی اولاد میں رہا۔ چہارم ان کی روایت عموماً با قاعدہ اسناد کے ساتھ کتبِ سیرت و حدیث میں آئی، اس لیے ان کا جائزہ بھی انہی اصولوں پر ہوتا ہے جن پر دیگر روایات کا ہوتا ہے۔

تاریخِ حدیث کے اعتبار سے ان دستاویزات کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ اس تصور کی تردید کرتی ہیں کہ حدیث صدیوں تک صرف زبانی رہی؛ حقیقت یہ ہے کہ کتابتِ حدیث و احکام کی جڑیں عہدِ نبوی ہی میں موجود تھیں، اگرچہ با قاعدہ سرکاری تدوین بعد میں ہوئی۔ البتہ علمی امانت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مخصوص دستاویز کا درجہ اس کی اپنی سند کی روشنی میں متعین کیا جائے، کیونکہ ان میں صحیح، حسن اور ضعیف ہر درجے کی روایات ملتی ہیں، اور کسی دستاویز کے مشہور ہونے سے اس کی ہر تفصیل قطعی نہیں ہو جاتی؛ قطعی احکام کے باب میں اہلِ علم کی تحقیق ہی معتبر ہے۔

حاصلِ کلام

خلاصہ یہ ہے کہ عہدِ نبوی میں مکتوبہ معاہدات و فرامین ایک منظم تحریری نظام کا حصہ تھے جن میں صحیفۂ مدینہ جیسا دستوری معاہدہ، حدیبیہ جیسا صلح نامہ، حکمرانوں کے نام دعوتی خطوط، نجران جیسے امان نامے اور عمرو بن حزم جیسے فقہی فرامین شامل ہیں۔ ان دستاویزات نے اسلامی ریاست کے قانون، انتظام اور دعوت کو تحریری بنیاد فراہم کی اور بعد کی تدوینِ حدیث کے لیے ماحول اور نمونہ مہیا کیا۔ تاریخِ حدیث کا طالب علم جب ان تحریروں کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ حفاظتِ دین کا نبوی نظام زبانی روایت اور کتابت دونوں پر مشتمل تھا، اور یہی متوازن تصویر اس دور کی اصل حقیقت ہے۔

سوال نمبر 2: سیدنا علیؓ کے دورِ خلافت میں روایتِ حدیث کے معاملے میں نرمی کی پالیسی

سوال نمبر 2: سیدنا علیؓ کے دورِ خلافت میں روایتِ حدیث کے معاملے نرمی کی پالیسی اختیار کی گئی اس ضمن میں اپنی معلومات کو آسان اور سلیس زبان میں تحریر کیجیے۔ (20 نمبر)

تعارف

خلفائے راشدین کے ادوار میں روایتِ حدیث کے بارے میں ہر خلیفہ کا انداز اس کے زمانے کے حالات کے مطابق رہا۔ سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے سخت احتیاط برتی اور نئی روایت قبول کرنے میں غیر معمولی تثبت سے کام لیا۔ سیدنا عمر فاروقؓ نے روایت کے ساتھ گواہ یا مؤید کا مطالبہ کیا اور بے ضرورت کثرتِ روایت کی حوصلہ شکنی کی، تاکہ جھوٹ یا غلطی کی گنجائش نہ رہے۔ سیدنا عثمان غنیؓ نے بھی مسندِ خلافت سے عام اعلان کے ذریعے روایت میں احتیاط کی تاکید کی۔ سوال یہ ہے کہ سیدنا علیؓ کے دور میں یہ پالیسی کس رخ پر گئی اور اس میں نرمی کہاں اور کس طرح آئی۔ اس سوال کا سادہ اور سلیس جواب یہ ہے کہ سیدنا علیؓ کے دور میں سابقہ سخت شرائط میں نسبتاً نرمی اختیار کی گئی، روایت کا دائرہ وسیع ہوا اور خاص طور پر کوفہ علم و روایت کا بڑا مرکز بن گیا، البتہ یہ نرمی اندھی آزادی نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ راوی سے قسم لینے جیسی نئی احتیاط بھی موجود تھی۔ ذیل میں اس موضوع

کو پس منظر، نرمی کی صورتیں، اس کے اسباب، اس دور کی احتیاطی تدابیر اور اس کے اثرات کے عنوانات کے تحت آسان زبان میں بیان کیا گیا ہے تاکہ طالب علم پوری تصویر ایک ساتھ سمجھ سکے۔

پس منظر: پہلے خلفاء کی احتیاطی پالیسی

نرمی کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس سے پہلے ماحول کیسا تھا۔ سیدنا ابو بکرؓ کے سامنے جب ایک مسئلے میں حدیث پیش کی گئی تو انہوں نے راوی کے ساتھ دوسرے صحابی کی گواہی طلب کی، یہی منہج ان کی پوری خلافت میں چلتا رہا۔ سیدنا عمرؓ نے اس احتیاط کو نظام کی صورت دی: جو شخص کوئی حدیث بیان کرتا اس سے کہا جاتا کہ اس پر گواہ پیش کرو، اور انہوں نے صوبوں کے گورنروں کو بھی کثرتِ روایت سے روکا، بلکہ مشہور صحابہ کو مدینے میں رکھنے کی پالیسی بھی اسی مقصد سے جڑی تھی کہ روایت کا مرکز قابو میں رہے۔ اس سختی کی وجہ یہ تھی کہ جھوٹی روایت کا خطرہ بڑھ رہا تھا اور بعض علاقوں میں غلط باتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے لگی تھیں۔ تاہم اس احتیاط کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بہت سے صحابہ روایت میں انتہائی محتاط ہو گئے اور احادیث کا بڑا ذخیرہ صرف سینوں میں محفوظ رہا۔ سیدنا عثمانؓ کے آخری دور میں فتنے شروع ہو چکے تھے اور حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ اس پس منظر میں سیدنا علیؓ کی خلافت آئی، جس کا مرکز مدینے سے کوفہ منتقل ہوا اور جس کے دور میں مسلمانوں کے درمیان جنگوں اور گروہ بندی جیسے غیر معمولی حالات پیدا ہوئے۔ یہی بدلے ہوئے حالات روایت کی پالیسی میں تبدیلی کا اصل سبب بنے۔

نرمی کی پالیسی کی صورتیں

سیدنا علیؓ کے دور میں نرمی کی پہلی صورت یہ تھی کہ ہر روایت کے ساتھ دوسرے راوی یا گواہ کی شرط پہلے جیسی سختی سے لاگو نہ رہی۔ اب کسی ثقہ اور معروف راوی کی بیان کردہ حدیث عام طور پر قبول کر لی جاتی اور اس کی تعلیم و اشاعت کی اجازت ہوتی۔ دوسری صورت یہ کہ خود سیدنا علیؓ کثرت سے احادیث بیان فرماتے اور خطبوں اور فیصلوں میں نبوی ارشادات پیش کرتے، جس سے عام فضا میں یہ احساس پیدا ہوا کہ روایت کا باب کھل گیا ہے۔ تیسری صورت یہ کہ دارالخلافہ کوفہ منتقل ہونے سے وہاں صحابہ و تابعین کی بڑی تعداد جمع ہو گئی، خصوصاً سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگردوں کا حلقہ پہلے ہی وہاں علمی سرگرمیوں کا مرکز تھا، اب کوفہ میں روایت و درس کے حلقے پہلے سے کہیں زیادہ وسیع

ہو گئے۔ چوتھی صورت یہ کہ مختلف علاقوں سے آنے والے وفود اور نئے مسلمان اپنی دینی ضرورت کے لیے احادیث سنتے اور اپنے علاقوں کو لے جاتے، اور امورِ خلافت کی مصروفیات کے سبب ہر روایت کی مرکزی جانچ کا وہ نظام برقرار نہ رہ سکا جو سیدنا عمرؓ کے نسبتاً پُرامن دور میں ممکن تھا۔ اس مجموعی ماحول کو ہی مؤرخین حدیث اس نرمی سے تعبیر کرتے ہیں جو سیدنا علیؓ کے دور میں روایت کے معاملے میں آئی۔

نرمی کے اسباب

اس نرمی کے کئی واضح اسباب تھے۔ پہلا سبب وقت کی ضرورت تھی: امت نئے مسائل اور فتنوں سے دوچار تھی، لوگوں کو رہنمائی کے لیے سنت کی طرف رجوع کرنا تھا، اس لیے روایت کو روکنا اب ممکن نہ رہا تھا۔ دوسرا سبب جغرافیائی وسعت تھی: دارالخلافہ عراق میں تھا اور وہاں سے شام، خراسان اور دیگر دور دراز علاقوں سے تعلق بڑھا اور ہر علاقے کے لوگ اپنے مقامی صحابہ و تابعین سے روایت لینے لگے۔ تیسرا سبب گروہی اختلافات تھے: جنگِ جمل اور صفین جیسے واقعات کے بعد ہر فریق اپنے موقف کی تائید میں احادیث و آثار پیش کرنے لگا، فضائل اور تاریخی روایات کی طلب بڑھ گئی اور روایت کا بازار گرم ہو گیا، یہ روایت کی وسعت کا ایک بڑا محرک تھا اگرچہ اسی ماحول نے وضعِ حدیث کے خطرے کو بھی بڑھا دیا۔ چوتھا سبب یہ تھا کہ کبار صحابہ کی وفات کا سلسلہ جاری تھا، اس لیے جو علم ان کے پاس تھا اسے اگلی نسل تک پہنچانا ضروری سمجھا گیا ورنہ اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ تھا۔ پانچواں سبب خود سیدنا علیؓ کی علمی شخصیت تھی: وہ قرآن و سنت کے گہرے عالم تھے، ان کے خطبات اور ارشادات خود روایت و تعلیم کی فضا کو فروغ دیتے تھے۔

نرمی کے باوجود احتیاط: قسم لینے کا طریقہ

یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ نرمی کا مطلب یہ تھا کہ سیدنا علیؓ نے ہر آنے والی بات بلا تحقیق قبول کر لی۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے احتیاط کی ایک نئی صورت اختیار کی جو ان کے دور کی خصوصیت بن گئی، اور وہ تھی راوی سے قسم لینا۔ روایات میں آتا ہے کہ جب کوئی شخص ان کے سامنے حدیث بیان کرتا تو وہ اس سے اس بات پر قسم لیتے کہ اس نے یہ حدیث واقعی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ اس طریقے کی حکمت یہ تھی کہ گواہ کا مطالبہ ہر جگہ عملی نہیں رہا تھا، مگر جھوٹ بولنے والے کے لیے اللہ کی قسم کھانا سخت مرحلہ

تھا، اس طرح سچ اور جھوٹ کی جانچ کا ایک مؤثر ذریعہ ہاتھ آ گیا۔ اس کے علاوہ وہ معلوم شدہ جھوٹے راویوں کی روایت قبول نہیں کرتے تھے اور مشکوک افراد سے سخت پوچھ گچھ کرتے تھے۔ بعض خاص معاملات میں وہ شواہد اور قرائن بھی دیکھتے تھے۔ اس لیے متوازن بیان یہ ہے کہ ان کے دور میں پالیسی پہلے ادوار کے مقابلے میں نرم ضرور ہوئی، روایت کا دائرہ پھیلا اور عام لوگوں تک احادیث پہنچنے لگیں لیکن جانچ کا اصول ختم نہیں ہوا بلکہ اس کی صورت بدل گئی: گواہ کی شرط کی جگہ راوی کی ثقاہت اور قسم جیسے ذرائع نے لے لی۔ یہی وہ امتزاج ہے جسے آسان زبان میں نرمی کے ساتھ احتیاط کہا جا سکتا ہے۔

جدول 1: ادوارِ خلافت میں روایتِ حدیث کی پالیسی — سادہ تقابل

دور	پالیسی کی نوعیت	نمایاں طریقہ
سیدنا ابو بکرؓ	سخت احتیاط	نئی روایت پر دوسرے صحابی کی گواہی طلب کرنا
سیدنا عمرؓ	منظم سختی	روایت پر گواہ کا مطالبہ، کثرتِ روایت کی حوصلہ شکنی
سیدنا عثمانؓ	احتیاط کی تاکید	منبر سے اعلان کہ وہی روایت بیان کی جائے جو پہلے ادوار میں سنی گئی ہو
سیدنا علیؓ	نسبتاً نرمی	ثقہ راوی کی روایت کی قبولیت، دائرے کی وسعت، ساتھ میں راوی سے قسم لینا

اس پالیسی کے اثرات

اس نرمی کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ حدیث کا بڑا ذخیرہ کوفہ اور دیگر مراکز سے اگلی نسل تک پہنچا، تابعین کی ایک بڑی جماعت نے صحابہ سے براہِ راست علم لیا اور بعد کی تدوین کی بنیادیں مضبوط ہوئیں۔ کوفہ میں فقہ و حدیث کی وہ روایت قائم ہوئی جو آگے چل کر بڑے علمی مکاتب کی بنیاد بنی۔ سیدنا علیؓ سے مروی احادیث و

قضایا کا ذخیرہ بھی اسی دور کی اشاعت کا نتیجہ ہے۔ منفی پہلو یہ ہے کہ اسی پھیلاؤ کے زمانے میں گروہی جھگڑوں نے وضعِ حدیث یعنی گھڑی ہوئی روایات کے رجحان کو بھی ہوا دی، خصوصاً فضائل اور تاریخی موضوعات میں، جس کا مقابلہ بعد کے محدثین نے جرح و تعدیل اور اصولِ روایت کے سخت نظام سے کیا۔ اس طرح یہ دور تاریخِ حدیث میں دوہرے اثرات رکھتا ہے: ایک طرف اشاعت و وسعت، دوسری طرف وہ خطرات جنہوں نے تنقیدِ حدیث کے فن کو جنم دیا۔ یہاں یہ تنبیہ بھی ضروری ہے کہ اس دور کے واقعات اور افراد کے متعلق قطعی دینی یا تاریخی فیصلے وہی معتبر ہیں جو اہلِ علم کی تحقیق سے ثابت ہوں، طالب علم کو چاہیے کہ وہ مختلف روایات کو اسی علمی توازن سے پڑھے جو درسی کتاب اور محققین کا منہج ہے۔

حاصلِ کلام

خلاصہ یہ ہے کہ سیدنا علیؓ کے دورِ خلافت میں روایتِ حدیث کے معاملے میں پہلے ادوار کی سخت شرائط کے مقابلے میں نرمی آئی: گواہ کی شرط عام قاعدہ نہ رہی، ثقہ راوی کی روایت قبول ہونے لگی، کوفہ علمی مرکز بن کر ابھرا اور احادیث وسیع پیمانے پر اگلی نسل تک پہنچنے لگیں۔ اس نرمی کے اسباب بدلتے ہوئے حالات، فتنوں کی فضا، جغرافیائی وسعت اور علم کے ضیاع کا اندیشہ تھے۔ تاہم یہ نرمی لاابالی نہیں تھی، کیونکہ سیدنا علیؓ نے راوی سے قسم لینے اور مشکوک راویوں کی جانچ جیسی احتیاط بھی جاری رکھی۔ یوں یہ دور روایت کی تاریخ میں وسعت اور نئی احتیاط کے امتزاج کا دور کہلاتا ہے۔

سوال نمبر 3: مدینہ منورہ میں اصحابِ صفہ کی تعلیم و تربیت کا انتظام

سوال نمبر 3: مدینہ منورہ میں اصحابِ صفہ کی تعلیم و تربیت کا کیا انتظام تھا، وضاحت کیجیے۔ (20 نمبر)

تعارف

اصحابِ صفہ مدینہ منورہ کی تاریخ کا وہ ممتاز طبقہ ہے جسے اسلام کی پہلی باقاعدہ تعلیمی اقامت گاہ کے طلبہ کہا جا سکتا ہے۔ صفہ مسجدِ نبوی کے شمالی جانب واقع ایک چبوترے یا سایہ دار جگہ کا نام تھا جہاں وہ مہاجر اور بے سہارا مسلمان قیام کرتے تھے جن کا مدینے میں نہ گھر تھا، نہ خاندان اور نہ روزگار کا کوئی مستقل وسیلہ۔ ان حضرات نے دنیوی مشاغل سے کٹ کر خود کو قرآن و سنت کے سیکھنے، عبادت اور جہاد کی تیاری کے لیے وقف کر دیا تھا۔ سیدنا ابوہریرہؓ، جن سے سب سے زیادہ احادیث مروی ہیں، خود اسی جماعت کے فرد تھے اور اپنی روایات میں اصحابِ صفہ کے احوال کا ذکر کرتے ہیں۔ سوال میں یہ پوچھا گیا ہے کہ ان حضرات کی تعلیم و تربیت کا انتظام کس طرح تھا، ان کے استاد کون تھے، انہیں کیا سکھایا جاتا تھا، ان کے کھانے پینے اور رہائش کا بندوبست کیسے ہوتا تھا اور اس نظام کے نتائج کیا نکلے۔ ہیں میں اس موضوع کو صفہ کے تعارف، تعلیمی نظام، اساتذہ و نصاب، معاشی انتظام، عملی تربیت اور اس نظام کے ثمرات کے عنوانات کے تحت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ مطالعہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیم کا آغاز کسی رسمی درسگاہ سے نہیں بلکہ مسجد سے ہوا اور اس کی پہلی صورت یہی اقامتی نظام تھا جس میں استاد بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود تھے۔

صفہ اور اصحابِ صفہ کا تعارف

صفہ کے لغوی معنی سایہ دار چبوترے کے ہیں۔ مسجدِ نبوی کے پچھلے حصے میں ایک ایسی جگہ مخصوص تھی جہاں چھت یا سایہ موجود تھا اور وہ نووارد مسلمانوں اور بے خانماں مہاجرین کے ٹھہرنے کی جگہ تھی۔ یہاں مقیم حضرات اصحابِ صفہ یا اہلِ صفہ کہلاتے تھے۔ ان کی تعداد حالات کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی تھی؛ عام حالات میں ستر کے قریب افراد کا ذکر ملتا ہے اور بعض اوقات یہ تعداد اس سے زیادہ بھی ہو جاتی تھی، جب کوئی نیا وفد یا مہاجرین کا گروہ آتا تو ان کی رہائش بھی یہیں ہوتی۔ ان میں سیدنا ابوہریرہؓ، ابو سعید خدریؓ، ابوذر غفاریؓ جیسے صحابہ بھی مختلف ادوار میں شامل رہے۔ ان حضرات کی نمایاں صفت یہ تھی کہ انہوں نے تجارت اور کاشتکاری چھوڑ کر درسِ نبوی کی صحبت کو اختیار کیا تھا؛ سیدنا ابوہریرہؓ خود بیان کرتے ہیں کہ لوگ بازاروں اور کھیتوں میں مصروف رہتے اور وہ مسجد میں حاضر رہ کر احادیث یاد کرتے، اسی بنا پر ان کی روایات کی کثرت اصحابِ صفہ

کی تعلیمی محنت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ آیتِ قرآنی میں بھی ان فقراء کا ذکر آیا ہے جو اللہ کی راہ میں روک دیے گئے ہوں اور زمین میں چل پھر نہ سکتے ہوں، مفسرین کی ایک بڑی جماعت نے اس سے اصحابِ صفہ کو مراد لیا ہے۔

تعلیمی انتظام: استاد، مقام اور طریقۂ تعلیم

اصحابِ صفہ کی تعلیم کا مرکزی انتظام یہ تھا کہ ان کے استاد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ وہ نمازوں کے بعد اور دیگر مقررہ اوقات میں مسجد میں تشریف فرما ہوتے، قرآن کی آیات کی تلاوت اور تشریح فرماتے، احکام بیان کرتے اور سوالات کے جوابات دیتے۔ چونکہ اصحابِ صفہ مستقل طور پر مسجد ہی میں مقیم تھے، اس لیے انہیں ہر مجلس میں حاضری کا موقع ملتا تھا جو دوسرے صحابہ کو ان کے مشاغل کی وجہ سے نہیں مل پاتا تھا۔ تعلیم کا طریقہ زیادہ تر سماع، حفظ اور مذاکرے پر مشتمل تھا: آیات اور ارشادات سنے جاتے، انہیں دلا دلا کر یاد کیا جاتا، پھر باہم دہرائے جاتے۔ بعض صحابہ لکھنا بھی جانتے تھے اور اپنے لیے تحریریں نقل کرتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عملی تربیت بھی فرماتے، یعنی نماز، روزہ اور معاشرتی معاملات کے احکام کر کے دکھائے جاتے اور غلطی پر نرمی سے اصلاح کی جاتی۔ جب مدینے میں نئے مسلمان یا وفود آتے تو ان کی ابتدائی تعلیم بھی اسی نظام سے جڑ جاتی، اور بسا اوقات اصحابِ صفہ کے تربیت یافتہ افراد ہی کو استاد بنا کر باہر بھیجا جاتا۔

مقررین، قاری اور باہر بھیجے جانے والے معلمین

جیسے جیسے ضرورت بڑھتی گئی، تعلیم کا دائرہ پھیلتا گیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو باقاعدہ معلم مقرر فرمانا شروع کیا۔ ہجرت سے پہلے سیدنا مصعب بن عمیرؓ کو مدینے معلم بنا کر بھیجا گیا تھا، یہ اسی نظام کا پیش خیمہ تھا۔ ہجرت کے بعد جب قبائل درخواست کرتے کہ ان کی تعلیم کے لیے استاد بھیجے جائیں تو اصحابِ صفہ اور مسجد کے تربیت یافتہ قاریوں ہی میں سے جماعتیں روانہ کی جاتیں۔ رجیع اور بئرِ معونہ کے مشہور واقعات میں شہید ہونے والے ستر قاری اسی تربیت یافتہ جماعت سے تعلق رکھتے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفہ سے تیار ہونے والے افراد امت کے معلم بن کر نکلتے تھے۔ سیدنا عبادہ بن صامتؓ کے متعلق روایت ہے کہ وہ اصحابِ صفہ کو قرآن اور کتابت سکھاتے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ معلمی کا کام صرف ایک فرد تک محدود نہ تھا بلکہ باقاعدہ اساتذہ کی مدد بھی لی جاتی تھی۔ اسی طرح جب کسی کو کسی علاقے کا عامل یا قاضی بنا کر بھیجا

جاتا تو وہ وہاں تعلیم کا مرکز قائم کرتا۔ یہ سارا نظام ثابت کرتا ہے کہ صفہ محض رہائش گاہ نہیں بلکہ ایک تربیتی ادارہ تھا جس کی پیداوار معلمین، قاری، راوی اور مبلغین کی صورت میں پورے عرب میں پھیلی۔

کھانے پینے اور رہائش کا انتظام

تعلیم کے ساتھ اصحابِ صفہ کی بنیادی ضروریات کا انتظام بھی اس نظام کا حصہ تھا۔ ان کی رہائش صفہ ہی میں تھی، جہاں وہ سادہ بستر اور چٹائیوں پر زندگی گزارتے تھے۔ کھانے کا بندوبست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے تھے: جو صدقہ ہوتا وہ اصحابِ صفہ کے لیے ہوتا کیونکہ صدقہ آپ اور آپ کے اہلِ بیت کے لیے جائز نہ تھا، اور جو ہدیہ آتا اس میں سے بھی انہیں شریک کیا جاتا۔ مدینے کے خوشحال صحابہ کو ترغیب دی گئی تھی کہ وہ انہیں اپنے گھروں میں کھانا کھلائیں، چنانچہ انصار کے افراد انہیں باری باری اپنے ہاں لے جاتے اور کھجور کے خوشے مسجد میں لٹکا دیے جاتے جن سے وہ کھاتے رہتے۔ بعض اصحابِ صفہ موقع ملنے پر محنت مزدوری بھی کرتے، مثلاً لکڑیاں جمع کر کے فروخت کرنا، تاکہ خودداری باقی رہے۔ اس انتظام کی خصوصیت یہ ہے کہ طالب علم کی ذہنی آسودگی تعلیم کی شرط سمجھی گئی: جب پیٹ اور رہائش کا بوجھ معاشرے نے اپنے ذمے لے لی تو وہ پورے اطمینان سے علم میں لگ گئے۔ موجودہ دور کے اقامتی مدارس اور طلبہ کے وظائف کا تصور اسی نبوی طرز کی یاد دلاتا ہے۔

جدول 1: اصحابِ صفہ کے نظام کے اجزا — خلاصہ

جز	تفصیل
رہائش	مسجدِ نبوی کا صفہ؛ بے گھر مہاجرین اور طلبہ کے لیے سایہ دار چبوترہ
استادِ اعلیٰ	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود؛ بعد میں مقرر کردہ صحابہ اساتذہ
نصاب	قرآن کا حفظ و فہم، احادیث و احکام، عملی عبادات، کتابت (بعض کے لیے)
طریقہ	سماع، حفظ، مذاکرہ، سوال و جواب اور عملی تربیت

صدقات، انصار کی دعوتیں، کھجور، جزوی خود کفالت	معاش
راوی، قاری اور معلمین کی جماعت، جنہیں قبائل کی تعلیم کے لیے بھیجا گیا	ماحصل

اس نظام کے ثمرات واثرات

اصحابِ صفہ کے نظام کے ثمرات امت کی تاریخ پر گہرے مرتب ہوئے۔ سب سے پہلا یہ کہ حدیث کی حفاظت میں ان کا حصہ نمایاں ہے؛ سب سے کثیر الروایہ صحابی سیدنا ابو ہریرہؓ اسی نظام کی پیداوار ہیں، ان کی پانچ ہزار سے زائد مرویات اسی شب و روز کی حاضری کا نتیجہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ تفسیر و قراءت کے بڑے نام بھی اسی ماحول سے نکلے اور قرآن کی تعلیم عرب کے گوشوں تک پہنچی۔ تیسرے یہ کہ اس نظام نے علم کے لیے دنیوی زندگی کی قربانی کا وہ نمونہ پیش کیا جس نے بعد کے ہر دور میں مدارس اور خانقاہی تعلیمی نظام کو متاثر کیا؛ مسجد کو مرکز بنا کر، استاد کی صحبت کو بنیاد بنا کر اور طلبہ کی کفالت معاشرے کے ذمے رکھ کر پڑھانے کا یہی نمونہ بعد میں بغداد، دمشق، قرطبہ اور برصغیر کے مدارس تک پہنچا۔ چوتھے یہ کہ ان حضرات کی سادگی، قناعت اور شب بیداری نے اخلاقی تربیت کو محض نصابی علم سے آگے بڑھا کر عملی زندگی کا حصہ بنا دیا۔ البتہ یہ بھی واضح رہے کہ ان کی غربت اختیاری وقف کی تھی، دینی مجبوری نہیں، کیونکہ جب ان میں سے کسی کو موقع ملتا وہ معاش بھی اختیار کرتا اور سماجی خدمت میں بھی شریک ہوتا۔ یہ توازن ہی اس نظام کی اصل روح ہے۔

حاصلِ کلام

خلاصہ یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں اصحابِ صفہ کی تعلیم و تربیت کا انتظام ایک مکمل نظام تھا: رہائش مسجدِ نبوی کے صفہ میں، استاد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقرر کردہ صحابہ، نصاب قرآن و حدیث اور عملی احکام، طریقہ سماع و حفظ و مذاکرہ، اور معاش کا ذمہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مدنی معاشرے کے سپرد۔ اس نظام نے راویوں، قاریوں اور معلموں کی وہ جماعت تیار کی جس کے ذریعے دین کا علم اگلی نسلوں اور دور دراز کے علاقوں تک پہنچا۔ یہی نمونہ اسلامی تعلیمی تاریخ کی پہلی اور بنیادی کڑی ہے۔

سوال نمبر 4: عمر بن عبدالعزیز کی تدوینِ حدیث کے حوالے سے خدمات کا جائزہ

سوال نمبر 4: عمر بن عبدالعزیز کی تدوینِ حدیث کے حوالے سے خدمات کا جائزہ لیجیے۔ (20 نمبر)

تعارف

تدوینِ حدیث کی تاریخ میں اموی خلیفہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز کا نام اس سنگِ بر آستانہ ہے جہاں سے حدیث کی حفاظت انفرادی کوشش سے بڑھ کر سرکاری سطح کی منظم مہم بن جاتی ہے۔ پہلی صدی ہجری کے اختتام تک صحابہ کی جماعت تقریباً ختم ہو چکی تھی اور تابعین کا طبقہ بھی رخصت ہو رہا تھا، احادیث زیادہ تر سینوں میں محفوظ تھیں اور کچھ منتخب صحائف تحریری صورت میں موجود تھے۔ اس نازک مرحلے پر عمر بن عبدالعزیز نے فیصلہ کیا کہ حدیث کو باقاعدہ سرکاری سطح پر جمع اور تحریری صورت میں محفوظ کیا جائے۔ ان کی اس خدمت کو محدثین اور مؤرخین نے یک زبان سراہا ہے اور امام مالک و دیگر ائمہ نے تدوینِ حدیث کی ابتدا کا سہرا انہی کے سر باندھا ہے۔ سوال میں ان کی انہی خدمات کا جائزہ مطلوب ہے۔ ذیل میں تدوین سے پہلے کی صورت حال، ان کے فرمان کی تفصیل، ابن شہاب زہری کا کردار، اس کام کے طریقہ کار، اس کے اثرات اور اس جائزے کے مجموعی نتائج بیان کیے گئے ہیں۔ واضح رہے کہ تدوین سے مراد یہاں احادیث کو جمع کر کے تحریری صورت میں محفوظ کرنا ہے، جبکہ موضوعی ابواب بندی کے ساتھ تصنیف کا مرحلہ اس کے بعد دوسری صدی میں مزید پختہ ہوا، اس فرق کو سمجھنا اس سوال کی بنیاد ہے۔

تدوین سے پہلے کی صورت حال

عمر بن عبدالعزیز کی خلافت سے پہلے حدیث کی حفاظت تین ذرائع سے ہو رہی تھی: صحابہ و تابعین کا حفظ و سماع، ذاتی صحائف اور مجالسِ درس کی زبانی روایت۔ صحیفۂ صادقہ، صحیفہ ہمام بن منبہ اور بعض صحابہ کے ذاتی مجموعے موجود تھے مگر یہ سارا کام انفرادی سطح کا تھا اور کسی مرکزی نظام کے بغیر تھا۔ خطرے کے عوامل بھی بڑھ رہے تھے: کبار تابعین کا انتقال تیزی سے ہو رہا تھا، دور دراز کے علاقوں میں جہاں کوئی بڑا عالم باقی نہ رہتا وہاں روایات کے ضائع ہونے کا اندیشہ تھا، اور گروہی اختلافات کے دور میں وضعِ حدیث کا رجحان بھی پیدا ہو چکا تھا۔ خود عمر بن عبدالعزیز نے اپنے فرمان میں اسی خدشے کا اظہار کیا کہ علم کے اٹھ جانے اور علماء کے ختم ہونے کا ڈر ہے، اس لیے سنت کو لکھ کر

محفوظ کر لیا جائے۔ یہ فہم و فراست اس بات کی علامت تھی کہ وہ محض حکمران نہیں بلکہ خود فقیہ و عالم تھے، مدینے کی گورنری کے دور میں وہ فقہائے مدینہ کی مجلس سے منسلک رہے تھے اور ان کی علمی مجلسوں کا ذوق ان کی پالیسی میں بھی جھلکتا ہے۔

تدوین کا فرمان اور اس کی تفصیل

عمر بن عبدالعزیز نے تقریباً 99 یا 100 ہجری میں مدینہ کے گورنر ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم کو تحریری فرمان بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور سنت کو تلاش کر کے لکھ لو، کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور اہلِ علم کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس فرمان کی بعض روایات میں یہ تفصیل بھی ملتی ہے کہ خاص طور پر عمرہ بنت عبدالرحمن اور قاسم بن محمد جیسے کبار تابعین کے پاس موجود روایات کو محفوظ کیا جائے، کیونکہ عمرہ انصاریہ سیدہ عائشہ کی خاص شاگردہ تھیں اور قاسم بن محمد فقہائے سبعہ میں سے تھے۔ اسی طرح خلیفہ نے مختلف صوبوں کے گورنروں اور علماء کو بھی اس مہم میں شریک ہونے کا حکم دیا اور بعض روایات کے مطابق اس کام کے لیے سرکاری سطح پر معاوضہ اور سہولت کا بھی اہتمام ہوا۔ فرمان کی عبارت اور اس کے پس منظر کی یہ تفصیل صحیح بخاری کی کتاب العلم میں تعلیقاً اور دیگر آثار میں مسنداً ملتی ہے، اسی بنا پر اس واقعے کو تاریخِ حدیث کے مستند ترین موڑوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

Figure 2: Steps of the Official Compilation (Tadwin) of Hadith

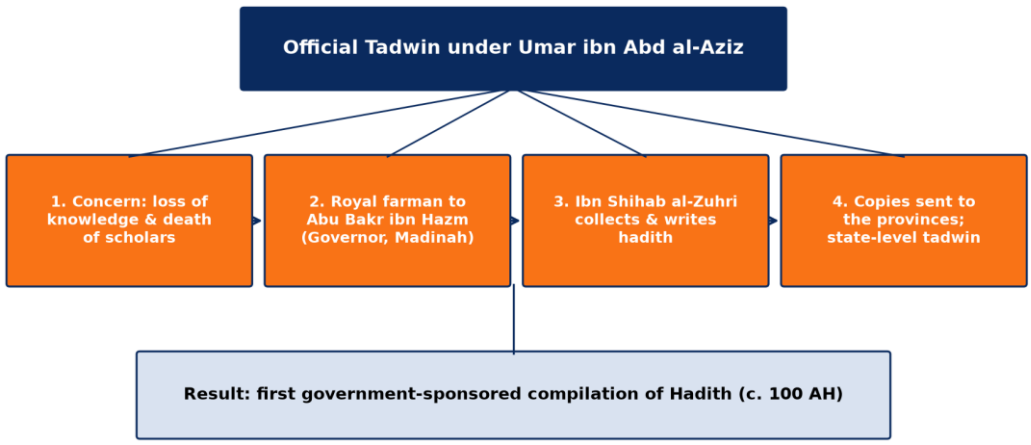

شکل 1: عمر بن عبدالعزیز کے دور میں سرکاری تدوین کے مراحل

امام ابن شہاب زہری کا مرکزی کردار

اس مہم کی عملی تکمیل میں سب سے بڑا نام امام محمد بن مسلم بن شہاب زہری کا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز نے انہیں خصوصی طور پر اس خدمت پر مامور کیا اور زہری نے مدینہ اور شام میں موجود روایات کو وسیع پیمانے پر جمع کر کے کتابی صورت دی۔ زہری خود بیان کرتے ہیں کہ انہیں اس سے پہلے اس وسعت کے ساتھ کتابت کی عادت نہ تھی مگر امیر کے حکم پر انہوں نے باقاعدہ دفاتر تیار کیے جو اونٹوں پر لاد کر دربار میں بھیجے گئے۔ زہری کی اہمیت اس لیے دوچند ہے کہ وہ تابعین کے ان آخری بڑے حفاظ میں سے تھے جنہوں نے بڑی تعداد میں صحابہ و کبار تابعین سے روایت کی تھی، اور ان کے شاگردوں میں امام مالک، سفیان بن عیینہ اور معمر جیسے ائمہ شامل ہوئے جن کے ذریعے یہ ذخیرہ آگے بڑھا۔ اس طرح عمر بن عبدالعزیز کا فرمان محض ایک دستاویز نہیں رہا بلکہ اس نے زہری جیسے عالم کی زندگی کو اس کام کے لیے وقف کرا دیا۔ مؤرخین اسی لیے کہتے ہیں کہ تدوینِ حدیث کی پہلی سرکاری کوشش کا فرمان عمر بن عبدالعزیز کا اور اس کی پہلی بڑی عملی صورت زہری کی محنت ہے۔

خدمات کے دیگر پہلو اور طریقہ کار

عمر بن عبدالعزیز کی خدمات فرمان تک محدود نہیں تھیں۔ ایک طرف انہوں نے اساتذہ کی تقرری اور درس کے حلقوں کی سرپرستی کی، دوسری طرف عدالت اور تقویٰ کی فضا قائم کر کے راویوں کے کردار کی اصلاح کا بھی ماحول پیدا کیا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حدیث کی حفاظت صرف کاغذ سے نہیں بلکہ اہلِ علم کی زندگیوں کی حفاظت سے ہوتی ہے۔ ان کے دور کی پالیسی میں یہ نکتہ بھی ملتا ہے کہ علماء کو شہروں میں تعلیم پر مامور کیا گیا اور لوگوں کو سنت کی طرف بلایا گیا۔ ان کا ذاتی عمل بھی اسی پالیسی کا نمونہ تھا: وہ خود احادیث یاد کرتے، ان پر عمل کرتے اور اپنے خطوط و احکام میں سنت سے استدلال کرتے۔ ان کی خلافت کی مدت مختصر، تقریباً ڈھائی سال، رہی، اس لیے تدوین کا کام ان کی زندگی میں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا، لیکن شروع کی گئی سمت اتنی درست تھی کہ بعد کے خلفاء اور علماء نے اسی راہ کو آگے بڑھایا اور دوسری صدی میں مدونات و مصنفات کا عظیم سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس اعتبار سے ان کی خدمت کی نوعیت بانی اور محرک کی ہے، مکمل کنندہ کی نہیں، اور تاریخ میں انہیں اسی اعزاز سے یاد کیا جاتا ہے۔

جدول 1: عمر بن عبدالعزیز کی تدوینِ حدیث کی خدمات — خلاصہ

پہلو	تفصیل
پس منظر	صحابہ و کبار تابعین کی وفات، علم کے ضیاع کا اندیشہ، وضعِ حدیث کا خطرہ
فرمان	ابو بکر بن حزم (گورنرِ مدینہ) کو سنت و حدیث لکھ کر محفوظ کرنے کا تحریری حکم، لگ بھگ 100 ہجری
مرکزی عالم	امام ابن شہاب زہری — مدینہ و شام کی روایات کی وسیع جمع و تحریر
وسعت	صوبوں کے علماء و گورنروں کو مہم میں شرکت کی ہدایت
اثر	سرکاری تدوین کی پہلی منظم کوشش؛ دوسری صدی کی تصنیف و تالیف کی راہ ہموار

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

جائزہ: خدمات کا تنقیدی خلاصہ

مجموعی جائزہ یہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کی تدوینِ حدیث کی خدمت تین اعتبار سے فیصلہ کن ہے۔ پہلے یہ کہ انہوں نے خطرے کو بروقت پہچانا؛ اگر یہ قدم ایک دو نسل مزید مؤخر ہوتا تو صحابہ کے آخری شاگردوں کے ساتھ بڑا ذخیرہ ضائع ہو جاتا۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے اس کام کو ریاستی ذمہ داری بنایا، جس سے وسائل، تسلسل اور اجتماعی اعتماد حاصل ہوا اور کسی فرد کی موت سے کام رکنے کا خطرہ کم ہو گیا۔ تیسرے یہ کہ انہوں نے صحیح آدمی کا انتخاب کیا، یعنی زہری جیسے حافظ و فقیہ کو یہ خدمت سونپی جس کے شاگردوں نے اسے امت گیر تحریک بنا دیا۔ بعض محققین یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ آیا تدوین کی ابتدا کا سہرا مکمل طور پر انہی کو جاتا ہے، کیونکہ انفرادی کتابت اس سے پہلے موجود تھی؛ اس کا متوازن جواب یہ ہے کہ انفرادیت اور سرکاری تدوین میں فرق ہے: کتابت پہلے سے تھی، لیکن علم کو محفوظ کرنے کا باضابطہ فرمان اور منظم مہم انہی کا کارنامہ ہے۔ اسی توازن سے ان کی خدمات کا جائزہ مکمل ہوتا ہے اور یہی درسی کتابوں کا بھی حاصل ہے۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ عمر بن عبد العزیز نے علم کے ضیاع کے اندیشے کو بھانپ کر مدینہ کے گورنر ابو بکر بن حزم کو تدوین کا فرمان جاری کیا، امام زہری کو اس مہم کا مرکزی نگران بنایا اور صوبوں تک اس کام کو پھیلایا۔ مختصر دورِ خلافت کے باوجود ان کی یہ خدمت تاریخِ حدیث کا وہ موڑ ہے جہاں سے حدیث کی حفاظت قومی و اجتماعی ذمہ داری بن گئی اور آنے والی صدیوں کی عظیم تصانیف کی بنیاد پڑی۔ اسی لیے ائمہ و مؤرخین انہیں تدوینِ حدیث کے بانی سرپرست کے طور پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

سوال نمبر 5: اہلِ کلام اور محدثین کے باہمی اختلافات کا حدیث پر اثر — جامع نوٹ

سوال نمبر 5: اہلِ کلام اور محدثین کے باہمی اختلافات کا حدیث پر کیا اثر مرتب ہوا؟ اس موضوع پر ایک جامع نوٹ قلم بند کیجیے۔ (20 نمبر)

تعارف

اسلامی علمی تاریخ میں محدثین اور اہلِ کلام دو بڑے علمی دھارے رہے ہیں۔ محدثین کا منہج روایت، اسناد اور نصوص کی حفاظت پر قائم تھا، جبکہ اہلِ کلام یعنی متکلمین کا منہج عقائد کے دفاع میں عقلی دلائل، جدل اور مناظرے پر مرکوز تھا۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں جب یونانی فلسفے کے تراجم، نئے مذہبی فرقوں اور خارجی افکار کے چیلنج سامنے آئے تو عقائد کی تشریح کے طریقے پر ان دونوں دھاروں کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوئے۔ سوال یہ ہے کہ ان اختلافات کا خود حدیث پر کیا اثر پڑا۔ اس نوٹ میں یہ اثر دونوں رخوں سے بیان کیا گیا ہے: مثبت اثرات، جیسے اصولِ حدیث کی تدوین، جرح و تعدیل کی پختگی اور حدیث کے دفاع میں نئی تصانیف، اور منفی اثرات، جیسے فرقہ وارانہ وضعِ حدیث، تاویل کی کشمکش اور محنہ جیسے واقعات۔ یہ موضوع خالصتاً علمی و تاریخی ہے؛ کسی فرد یا گروہ کے بارے میں قطعی دینی فیصلہ اس نوٹ کا مقصد نہیں، اور عقائد کے دقیق مسائل میں اہلِ علم کی طرف رجوع ہی درست راستہ ہے۔ البتہ تاریخِ حدیث کے طالب علم کے لیے اس کشمکش کو سمجھنا ضروری ہے، کیونکہ موجودہ اصولِ حدیث کی بہت سی باریکیاں اسی دور کی بحثوں سے نکلی ہیں۔

اختلاف کی نوعیت اور بڑے موضوعات

محدثین اور متکلمین کے اختلاف کی جڑ منہج کا فرق تھا۔ محدثین کہتے تھے کہ عقیدے میں اصل ماخذ قرآن و سنت ہے اور سنت کی ثبوت اسناد سے ہوتا ہے، اس لیے راویوں کی جانچ اور نص کی اتباع ہی راستہ ہے۔ متکلمین کا کہنا تھا کہ مخالفین عقلی دلائل سے حملہ کرتے ہیں، اس لیے عقائد کو عقلی اصولوں سے مرتب کرنا اور ہر نص کو اپنے مسلمہ عقلی فریم میں سمجھنا ضروری ہے۔ اختلاف کے بڑے موضوعات میں صفاتِ الٰہی کی تشریح، خلقِ قرآن کا مسئلہ، ایمان کی تعریف اور اس میں عمل کی شمولیت، قضا و قدر اور رویتِ باری جیسے مسائل شامل تھے۔ بعض متکلمین نے اخبارِ آحاد کو عقائد میں حجت ماننے سے انکار کیا یا انہیں ظنی قرار دے کر ثانوی درجہ دیا، جبکہ محدثین کے نزدیک صحیح خبرِ واحد بھی عقیدہ و عمل میں دلیل تھی۔ اسی طرح بعض متکلمین نے اپنے عقلی اصولوں سے ٹکرانے والی احادیث کی دور از کار تاویلیں کیں، اور اس کے جواب میں محدثین نے ظاہرِ نص کی پاسداری پر زور دیا۔ عباسی دور میں جب بعض متکلم مکاتب کو سرکاری سرپرستی ملی تو یہ اختلاف علمی حلقوں سے نکل کر اقتدار کے ایوانوں تک جا پہنچا، جس کے نتائج حدیث اور اہلِ حدیث دونوں پر گہرے مرتب ہوئے۔

حدیث پر مثبت اثرات

اس کشمکش کے حدیث پر کئی مثبت اثرات بھی مرتب ہوئے جنہیں نظر انداز کرنا زیادتی ہو گی۔ سب سے پہلے علمِ جرح و تعدیل کو غیر معمولی فروغ ملا، کیونکہ جب مخالف فریق راویوں کے عقائد پر اعتراض کرنے لگے تو محدثین نے ہر راوی کے حالات، عقیدہ، ضبط اور عدالت کو باقاعدہ ریکارڈ کرنا شروع کیا اور اسماء الرجال کی عظیم کتابیں وجود میں آئیں۔ دوسرے اصولِ حدیث ایک مستقل فن بن کر مرتب ہوا؛ امام شافعی کی الرسالۃ نے خبرِ واحد کی حجیت پر استدلال کی بنیاد رکھی اور بعد میں یہ بحث مصطلح الحدیث کی صورت میں پختہ ہوتی گئی۔ تیسرے حدیث کے دفاع میں خصوصی تصانیف لکھی گئیں، مثلاً مشکل احادیث کی تشریح، مختلف الحدیث کے مباحث اور صفات وغیرہ پر وارد احادیث کی توجیہ پر کتابیں آئیں جن سے علمِ حدیث میں تشریحی ادب کا بڑا ذخیرہ پیدا ہوا۔ چوتھے متنِ حدیث کی تنقید کو بھی تقویت ملی، کیونکہ متکلمین جن احادیث کو عقلی محال قرار دیتے

ان کے جواب میں محدثین متن کی معنوی جانچ کے اصول مزید واضح کرتے گئے۔ پانچویں یہ کہ کلامی مکاتب نے بھی بالآخر حدیث سے استدلال کو اپنایا اور متکلم محدثین کی ایسی شخصیات سامنے آئیں جنہوں نے دونوں علوم کو جمع کیا، جس سے مجموعی علمی ماحول زرخیز ہوا۔

حدیث پر منفی اثرات

اس کے منفی اثرات بھی کم سنگین نہیں۔ سب سے بڑا منفی اثر فرقہ وارانہ وضعِ حدیث تھا: جب ہر گروہ اپنے عقیدے کی تائید چاہتا تھا تو کمزور اور بعض بدبخت عناصر نے من گھڑت روایات گھڑنا شروع کر دیں، خصوصاً فضائل، مناقب اور عقائد کے متنازعہ موضوعات میں، جس سے محدثین پر موضوعات کی پہچان کی بھاری ذمہ داری آ گئی اور موضوعات پر الگ تصانیف لکھنی پڑیں۔ دوسرا اثر محنہ کا واقعہ ہے: خلقِ قرآن کے مسئلے میں جب سرکاری سطح پر محدثین پر سختی ہوئی اور امام احمد بن حنبل جیسے ائمہ آزمائش سے گزرے تو علمی فضا میں تلخی پیدا ہوئی، اگرچہ اسی ثابت قدمی نے سنت کے وقار کو بلند بھی کیا۔ تیسرا اثر تاویل کی افراط تھا جس میں بعض اوقات نص کی ظاہری مراد سے دور جا کر عقلی قالب میں ڈھالنے کی کوشش ہوئی، اس سے عام طالب علم کے لیے صحیح مفہوم تک رسائی مشکل ہوئی۔ چوتھا اثر درجہ بندی کی کشمکش تھا: اخبارِ آحاد کی حجیت پر بحث نے بعض حلقوں میں صحیح احادیث کے بارے میں بھی تردد پیدا کیا۔ پانچواں اثر شخصی اور گروہی جرح کا رجحان تھا، جس میں بعض اوقات علمی اختلاف ذاتی مخالفت میں بدل جاتا اور راوی کی ثقاہت اس کے مکتب کی بنیاد پر پرکھی جانے لگتی، جسے بعد کے منصف محققین نے درست کرنے کی کوشش کی۔

جدول 1: اہلِ کلام و محدثین کے اختلاف کے حدیث پر اثرات — خلاصہ

مثال / صورت	اثر	رخ
راویوں کے عقائد و ضبط کی باقاعدہ جانچ اور ریکارڈ	جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کی ترقی	مثبت
الرسالۃ سے مصطلح الحدیث تک خبر کی حجیت کی بحث	اصولِ حدیث کی تدوین	مثبت
مختلف الحدیث اور مشکل احادیث کی تشریح پر	تشریحی و دفاعی ادب	مثبت

تصانیف		
عقائدی تائید کے لیے من گھڑت روایات، موضوعات پر الگ کتابیں	فرقہ وارانہ وضعِ حدیث	منفی
امام احمد بن حنبل کی آزمائش، علمی فضا میں تلخی	محنہ اور سرکاری دباؤ	منفی
بعض صحیح احادیث کے گرد تردد کی فضا	تاویل کی شرائط اور حجیتِ خبرِ واحد پر بحث	منفی

توازن کی راہ اور بعد کا علمی ارتقاء

وقت کے ساتھ اہلِ علم میں توازن کی راہیں بھی نکلتی رہیں۔ ایک بڑی تعداد ایسے علماء کی رہی جنہوں نے حدیث اور کلام دونوں میں مہارت حاصل کی اور یہ موقف اختیار کیا کہ عقل اور نقل میں حقیقی تعارض نہیں ہوتا، صحیح نقل اور صریح عقل جمع ہو سکتی ہیں، اور جہاں ظاہری ٹکراؤ نظر آئے وہاں اصولوں کے مطابق جمع و توفیق کی جاتی ہے۔ اس متوازن منہج نے حدیث کو دونوں انتہاؤں سے بچایا: نہ نصوص کو بے لگام تاویل کے سپرد کیا گیا اور نہ عقلی غور کو کلیتاً رد کیا گیا۔ اسی ماحول میں بعد کی صدیوں میں شرح نگاری، اصول نویسی اور موسوعات کی وہ روایت پختہ ہوئی جس پر آج کا علمِ حدیث کھڑا ہے۔ تاریخ کے طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ علمی اختلاف بذاتِ خود نقصان دہ نہیں ہوتا، نقصان اس وقت ہوتا ہے جب اختلاف تعصب، اقتدار کی مداخلت یا جعل سازی سے جڑ جائے۔ حدیث پر اس کشمکش کا مجموعی اثر اسی لیے دوہرا ہے: علمی پختگی بھی اسی سے آئی اور آزمائشیں بھی اسی راستے سے آئیں۔

حاصلِ کلام

خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ کلام اور محدثین کے اختلافات نے حدیث کو گہرائی سے متاثر کیا۔ مثبت رخ میں جرح و تعدیل، اصولِ حدیث، اسماء الرجال اور تشریحی ادب کو فروغ ملا اور حدیث کا دفاع مضبوط ہوا۔ منفی رخ میں فرقہ وارانہ وضع، سختی، تاویل کی افراط اور خبرِ واحد کی حجیت پر کشمکش سامنے آئی۔ مجموعی طور پر یہ کشمکش وہ بھٹی ثابت ہوئی جس میں سے گزر کر علمِ حدیث مزید نکھرا، اور بعد کے متوازن علماء نے نقل و عقل کے تعلق کی وہ صورت دی جس پر امت کا علمی نظام قائم رہا۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com